ڈاکٹر محمد ریاض

مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ

(۲)

رومی کا تتبع

اقبال کے ہاں رومی کے صوری اور معنوی تتبع کی کافی مثالیں موجود ہیں :

رومی۔ ہر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ و راست ‏ ‏ ما بفلک می رویم، عزمِ تماشا کراست
خود ز فلک برتریم وز ملک افزون تریم ‏ ‏ زین دو چرا نگذریم، منزلِ ما کبریاست

اقبال۔ گریۂ ما بی اثر، نالۂ ما نارسا است ‏ ‏ حاصلِ این سوز و ساز یک دلِ خونین نواست

رومی۔ بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست ‏ ‏ بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

اقبال۔ تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست ‏ ‏ بامن میا کہ مسلکِ شبیرؓم آرزوست

رومی۔ اگر دل از غمِ دنیا جدا توانی کرد ‏ ‏ نشاط و عیش بباغِ بقا توانی کرد

اقبال۔ درون لالہ گذر چون صبا توانی کرد ‏ ‏ بیک نفس گرہِ غنچہ وا توانی کرد

رومی۔ ای یار مقامردل پیش آ و دمی کم زن ‏ ‏ زخمی کہ زنی بر ما مردانہ و محکم زن

اقبال۔ بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن ‏ ‏ چون پختہ شدی خود را بر سلطنتِ جم زن

رومی۔ پردہ بردار ای حیات و جان جان افزای من ‏ ‏ غمگسار و ہم نشین و مونسِ شبہائے من

اقبال۔ شعلہ در آغوش دارد عشقِ بی پروای من ‏ ‏ بر نخیزد یک شرر از حکمتِ نازای من

رومی۔ من بیخود و تو بیخود ما را کہ برد خانہ ‏ ‏ من چند ترا گفتم کم خور دو سہ پیمانہ

اقبال۔ فرقی نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ ‏ ‏ این جلوتِ جانانہ، آن خلوتِ جانانہ

رومی۔ ای شادی آن روزی کز راہ تو باز آئی ‏ ‏ در روزکہ جان تابی چون ماہ ز بالائی

اقبال۔ این گنبدِ مینائی، این پستی و بالائی ‏ ‏ درشد بدلِ عاشق باین ہمہ پہنائی

رومی۔ ہر خیالی را خیالی می خورد ‏ ‏ فکر ہم بر فکرِ دیگر می چرد

اقبال- زیرِ گردون آدمِ، آدم را خورد — ملتی بر ملتی دیگر چرد

رومی- گر نغزمودی مقامی بر جناۃ — یا گفتی فی القصاص آمد حیاۃ

اقبال گفت قاضی فی القصاص آمد حیات — زندگی گیرد با این قانون ثبات

رومی- کردہ ای تاویل حرف بکر را — خویش را تاویل کن نی ذکر را

خویش را تاویل کن نہ اخبار را — مغز را بد گوئی نی گلزار را

بر ہوا تاویلِ قرآن می کنی — پست و کج شد از تو معنیِ سنی (دفتر ۱)

اقبال- زمن بر صوفی و ملّا سلامی — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

ولی تاویلِ شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(یا) خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

رومی- آنکہ شیران را کند روبہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

اقبال- حاجت سے مجبور مردانِ آزاد — حاجت ہے کرتی شیروں کو روباہ

رومی- کل یوم ھو فی شان بخوان — مرو را بی کار و بی فعلی مدان ۲۰۸/۱

اقبال- راز ہا با مردِ مومن باز گو — شرحِ رمزِ کل یوم باز گو

رومی- اندریں وادی مرو بی این دلیل — لا احب الآفلین گو چون خلیل

اقبال- جہان یکسر مقامِ آفلین است — درین غربت سرا عرفان ہمین است

اس کے علاوہ اقبال کی متعدد مستانہ فارسی غزلوں کا لب و لہجہ، مولانائے روم کی غزلوں کے انداز پر ہے - ہم یہاں علامہ مرحوم کی چند ایسی غزلیات کے مطالع یا بعض دوسرے اشعار نقل کر رہے ہیں:

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست — سبو ز ماست، ولی بادہ در سبوز کجاست

سوزِ سخن ز نالۂ مستانۂ دل است — این شمع را فروغ ز پروانۂ دل است

بہ آن دل کہ مستی ہای او از بادۂ خویش است — بگیر آن دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب — ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

مثلِ شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم — تن بہ تپیدن دہم، بال پریدن دہم

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من
صورت نپرستم من بت خانہ شکستم من
آن سیلِ سبک سیرم، ہر بند گسستم من
موج را از سینۂ دریا گسستن می‌توان
بحرِ بی پایاں بجوی خویش بستن می‌توان
بی تو از خوابِ عدم دیدہ گشودن نتوان
بی تو بودن نتوان، با تو نبودن نتوان
چو خورشیدِ سحر پیدا نگاہی میتوان کردن
ہمیں خاکِ سیہ را جلوہ گاہی می‌توان کردن
بجہانِ دردمندان تو بگو چہ کار داری
تب و تابِ ماشناسی؟ دلِ بی قرار داری؟
از چشمِ ساقی، مستِ شرابم
بی مَی خرابم، بی می خرابم
این ہم جہانی، آن ہم جہانی
این بے کرانی، آن بے کرانی

اقبال اپنے آپ کو "رومیِ عصر" کہتے ہیں۔ اور بو علی سینا (م ۴۲۸ھ) نیز امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کے فلسفیانہ و متکلمانہ مباحث پر تمثیلاتِ رومی کو ترجیح دیتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذان من
از و آموختم اسرارِ جان من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من
شرارِ جستہ ای گیر از درونم
کہ من مانندِ رومی گرم خونم

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
حق اگر سوزی ندارد حکمت است
شعر می‌گردد چو سوز از دل گرفت
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی
نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی
علاجِ ضعفِ یقیں اس سے ہو نہیں سکتا
غریب گرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
چو سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر
مرا از منطق آید بوی خامی
دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
بر و یم بستہ در ہا را گشاید
دو بیت از پیرِ رومی یا ز جامی

اقبال اپنے آپ کو، رومی کی مانند بت شکن قرار دیتے ہیں، بت شکنی، حضرت

ابراہیم خلیل علیہ السلام نے انجام دی تھی، مگر صوفیہ نے نفس شکنی کو بھی تمثیلاً بت شکنی قرار دیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں ہر وہ چیز "بت" تھی جو توجہ الی الحق میں مانع ہو۔ رومی نے عوامِ ہفتم ہجری میں خوف و ہراس، مال و منال سے بیجا بیزاری، توکّل کے غلط مفہوم پر اتکا کر کے کاہلی و بے عملی برتنے اور خشک تفلسف و تقشّف کو مرجعِ آمال قرار دینے والے اصنام کا قلع قمع کیا۔ اقبال نے بھی عصرِ حاضر میں مادیت، تشکک، الحاد، بے عملی، ہوسِ دولت اور ترسِ مرگ کے بت توڑے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (جزوی تشبیہ کا سہارا لے کر) اپنے آپ کو بت شکن یا خلیل قرار دیتے ہیں:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

بیا کہ مثلِ خلیلؑ این طلسم در شکنیم
کہ جز تو ہر چہ درین دیر دیدہ ام صنم است

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم

خدا داند کہ مانندِ براہیمؑ
بنارِ او چہ بی پروا نشستم

بزبانِ رومی اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

جز تو ای دانای اسرارِ فرنگ
کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانندِ خلیل اللہ مست
ہر کہن بت خانہ را باید شکست

تا می از خمخانۂ من خوردہ ای
کہنگی را از تماشا بردہ ای

معنیِ دین و سیاست باز گوی
اہلِ حق را زین دو حکمت باز گوی

بہر صورت، اقبال نے عصرِ حاضر میں تعلیماتِ رومی کو عام کرنے کی خاطر انتھک کوشش کی تاکہ پیرانِ حرم صحنِ حرم میں رہیں اور صحنِ کلیسا (افرنگ نوازی) سے دامن کشاں اور توبہ کناں اُٹھ آئیں۔ مثنوی مسافر کی غزلِ واحد کا مندرجہ ذیل شعر ہمارے مدعا کو واضح کر دے گا:

وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

مشترک موضوعات

رومی و اقبال کے چند پسندیدہ مشترک موضوعات ہیں۔ ان میں پہلا اہم مشترک موضوع

قوتِ اشراق یعنی باطنی حِسّوں کا قائل ہوتا ہے۔ اس موضوع پر یوں تو اکثر صوفیہ نے بیان کیا کہ ذکر کے ذریعے باطنی حسوں کے اشراق کا امکان ہے اور باطنی قویٰ ایسے حقائق کے ادراک میں مدد دیتے ہیں جو حواسِ خمسہ کے بس میں نہیں، مگر رومی و اقبال نے اس مضمون کو صدہا انداز میں بیان کیا اور بڑے لطیف معانی پیدا کیے ہیں۔ ان حضرات کے ہاں یہ مدعا، قلب، دل، نظر ضمیر اور بالخصوص "عشق" کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں   غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

رومی کے ہاں "عشق" بڑے وسیع معانی رکھتا ہے اور اقبال کے ہاں بلامبالغہ اس سے بھی وسیع تر۔ اقبال نے عشق کے جزئیات اور اسالیب بیان میں بہت کچھ اضافے فرمائے مگر کلیات وہی رومی والے نظر آتے ہیں، یعنی دونوں کے نزدیک "عشق" ایک ایسی قوت ہے جو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ہے اور اس سے محیر العقول کارنامے وجود میں لائے جا سکتے ہیں۔ عشق، جرأت و ہمت کا سرچشمہ ہے۔ اسے عواقب و مہالک کا خطرہ نہیں ہے۔ عشق، فیصلہ کرنے میں عقل کی مانند متذبذب اور متردّد نہیں۔ اسے حیلہ تراشیوں اور مکاریوں سے غرض نہیں۔ وہ بے باکی، درست کاری اور سعیِ پیہم سکھاتا ہے۔ اقبال کے تصورِ خودی کا عنصرِ لازم یہی عشق ہے۔ بہر صورت، عشق یا اس کے مرادفات کے تلانات کے پردے میں رومی و اقبال نے فلسفیوں، متکلموں، فقہا اور دیگر موشگافوں اور مصلحت اندیشوں پر انتقادات لکھے ہیں۔ دونوں کے نزدیک اس کائنات کے تحرک اور کارزارِ حیات کی گرمی کا اہم عنصر "عشق" ہے۔ انبیاء کرام، عشق کے مبلغ رہے ہیں۔ پس مومنِ واقعی اور عاشق، مرادف کلمات ہیں۔ رومی و اقبال نے صدہا بلکہ ہزارہا اشعار "عشق" کی توصیف میں لکھے ہیں۔ پھر بھی ایک مختصر انتخاب پیش کر دینا، قابلِ معذرت نہ ہوگا۔

رومی: آتشِ عشق است کاندر نے فتاد   جوششِ عشق است کاندر مے فتاد

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد   کوہ در رقص آمد و چالاک شد

شاد باش ای عشقِ خوش سودای ما   ای طبیبِ جملہ علت ہای ما

ای دوای نخوت و ناموس ما   ای تو افلاطون و جالینوس ما

عقل در شرحش چو خر در گل بخفت — شرح عشق و عاشقی هم عشق گفت
پر و بال ما کمند عشق اوست — مو کشانش می‌کشد تا کوی دوست
علت عاشق ز علت‌ها جداست — عشق اصطرلاب اسرار خداست
با دو عالم عشق را بیگانگی است — واندر آن هفتاد و دو دیوانگی است
غیر هفتاد و دو ملت کیش او — تخت شاهان تخته‌بندی پیش او
پس چه باشد عشق دریای عدم — در شکسته عقل را آن جا قدم
تو بیک خواری گریزانی ز عشق — تو بجز نامی چه می‌دانی ز عشق
عشق را صد ناز و استکبار هست — عشق با صد ناز می‌آید بدست
دور گردون را ز موج عشق دان — گر نبودی عشق بفسردی جهان
عشق آن شعله است کو چون برفروخت — هر چه جز معشوق باقی جمله سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند — در نگر آخر که بعد لا چه ماند
ماند الا الله باقی جمله رفت — شاد باش ای عشق شرکت سوز زفت
ملت عشق از همه دین‌ها جداست — عاشقان را مذهب و ملت خداست

از محبت تلخ‌ها شیرین شود — از محبت مس‌ها زرین شود
از محبت دردها صافی شود — وز محبت دردها شافی شود
از محبت سجن، گلشن می‌شود — وز محبت بار، بختی می‌شود
از محبت سنگ، روغن می‌شود — بی محبت موم آهن می‌شود
از محبت نیش نوشی می‌شود — وز محبت شیر، موشی می‌شود
از محبت مرده، زنده می‌شود — وز محبت، شاه بنده می‌شود
در نگنجد عشق در گفت و شنید — عشق دریائی است، قعرش ناپدید
قطره‌های بحر را نتوان شمرد — هفت دریا پیش آن بحر است خرد (مثنوی دفتر [illegible])

اقبال۔ بباغان باد فروردین دهد عشق — براغان غنچه چون پروین دهد عشق

شعاعِ مہرِ او قلزم شگاف است / ماہی دیدۂ رہ بین دہد عشق
بہ برگِ لالہ رنگ آمیزی عشق / بجانِ ما بلا انگیزی عشق
اگر این خاکدان را واشگافی / درونش بنگری خون ریزی عشق

تہی از ہای و ہوے میخانہ بودی / گلِ ما از شرر بیگانہ بودی
نبودی عشق و این ہنگامۂ عشق / اگر دل چون خرد فرزانہ بودی

عقلی کہ جہان سوزد، یک جلوۂ بیباکش / از عشق بیاموزد، آئینِ جہان تابی
عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد / از تاب و تبِ رومی تا حیرتِ فارابی
این حرفِ نشاط آور می گویم و می رقصم / از عشق دل آساید، با این ہمہ بیتابی
ہر معنیِ پیچیدہ در حرف نمی گنجد / یک لحظہ بہ دل در شو، شاید کہ تو دریابی

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست / اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہان ہم صلح و ہم پیکار عشق / آبِ حیوان تیغِ جوہر دار عشق
از نگاہِ عشق خارا شق شود / عشقِ حق آخر سراپا حق بود
کوہ پیشِ عشق چون کاہی بود / دل سریع السیر چون کاہی بود

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق / کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش / کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق / کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر / کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ / عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو / عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

جبر و قدر

رومی ایک صوفی صافی تھے اور ساتھ ساتھ ایک مفکر متکلم بھی۔ اقبال بھی معنوی اعتبار سے صوفی تھے اور ذہنی طور پر قرونِ اولیٰ کی طرف ہجرت کر کے زندگی گزار گئے[1] ان کے مفکر، فلسفی و متکلم ہونے کے بارے میں بحث تحصیلِ حاصل ہے۔ عیاں راچہ بیاں؟ اقبال کی تصانیف

---

[1] مکتوباتِ اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی

میں تصوف، فلسفہ اور کلامی مباحث حیرت انگیز حد تک ممزوج و مخلوط نظر آتے ہیں مشترکات موضوع کے اعتبار سے رومی و اقبال کا اشعریانہ نقطۂ نظر قابلِ توجہ ہے۔ معتزلہ ان کے ہاں بالعموم مطرود نظر آتے ہیں۔ اقبال نے ایک دو بیتی میں ابوالحسن اشعری (م ۳۲۴ھ) کے نظریۂ دوامِ روح پر صاد بھی کیا ہے:

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی — اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

جبر و قدر کے پیچیدہ مسئلے کے بارے میں دونوں کا نقطۂ نظر معتدل ہے کہ انسان ارادہ و عمل میں آزاد ہے مگر اس کی آزادی علی الاطلاق بھی نہیں۔ وہ ایک "دستِ غیب" کا دست نگر ہے۔ رومی کی تمثیلات "شیر و خرگوش" کے مکالمے (دفتر پنجم) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اقبال نے اس موضوع پر سیر حاصل لکھا ہے۔ اقبال، جزوی توافق کا سہارا لے کر بات کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان ایسا مفکر بتمام معنی کسی کا مقلد نہیں:

میانِ آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہان را جز بچشمِ خود نہ دیدم

یہاں مثال کے طور پر اقبال کے پیش کردہ بعض تازہ بتازہ کلامی مباحث کی طرف اشارہ کر دیں "توحید" کے ضمن میں اقبال فرماتے ہیں کہ اس کے تقاضے مسلمانوں کی وحدتِ فکر و نظر اور اتحاد ہیں نبوت کے لیے وہ رومی کی مانند معجزہ کی شرط کے حامی نہیں، مگر فرماتے ہیں کہ نبی برحق، ایک محکم و استوار امت وجود میں لاتا ہے جبر و قدر (تقدیر و تدبیر) کے مسئلے پر یہاں تک تو اقبال، رومی سے ہم آہنگ ہیں کہ:

سراپا معنیِ سربستہ ام من — نگاہِ حرف بازان برنتابم
نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور — کہ خاکِ زندہ ام، در انقلابم

چہ گویم از چگون و بی چگونش — برون مجبور و مختار اندرونش
چنین فرمودۂ سلطانِ بدر است — کہ ایمان در میانِ جبر و قدر است

تو ہر مخلوق را مجبور گوئی | اسیر بند نزد و دور گوئی
ولی جان از دم جان آفرین است | بچندین جلوہ ہا خلوت نشین است
ز جبر او حدیثی درمیان نیست | کہ جان بی فطرت آزاد جان نیست
شبیخون بر جہان کیف و کم زد | ز مجبوری بمختاری قدم زد

لیکن علامہ مرحوم نے تعدد تقادیر کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہر فرد کی تقدیر، جس طرح عرف عام میں کہا جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے مقرر نہیں کر دی۔ خدا کی دیگر نعمتوں کی مانند تقادیر بھی لاتعداد ہیں۔ البتہ فرد ہو یا قوم، اس کی ایک ابتدائی تقدیر موجود ہوتی ہے۔ جوں جوں اس فرد یا قوم کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اس کی تقدیر بھی بہتر نہج اختیار کر لیتی اور بدلتی رہتی ہے۔ زوال پذیر فرد یا قوم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خلاصہ یہ کہ تقدیر بدلتی رہتی ہے، بشرطیکہ قوم یا فرد خود بدلے۔ اقبال کی یہ توجیہہ یا تاویل دراصل ایک معروف آیۂ قرآن سے مستفاد ہے۔ پیام مشرق کے دیباچہ میں آپ نے لکھا تھا:

"..... اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جسے قرآن نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم"[۱۲] کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے....." جاوید نامہ میں آپ نے فرمایا ہے:

گر ز یک تقدیر خون گردد جگر | خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست | زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست
ارضیان نقد خودی در باختند | نکتۂ تقدیر را نشناختند

---

۱۲ قرآن مجید، الرعد : ۱۳

رمزِ باریکش بحرفی مضمر است — تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست — قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست
رنج بی گنج است، تقدیر این چنین — گنج بی رنج است، تقدیر این چنین
اصلِ دین این است اگر ای بی خبر — می شود محتاج انرد محتاج تر
وای آن دینی کہ خواب آرد ترا — باز در خوابِ گران دارد ترا
سحر و افسون است یا دین است این؟ — حبِ افیون است یا دین است این؟
طبعِ روشن مردِ حق را آبروست — خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست
نوعِ دیگر بین جہان دیگر شود — این زمین و آسمان دیگر شود

ضربِ کلیم کا ایک شعر اور ارمغانِ حجاز کی ایک دو بیتی بھی اس ضمن میں معروف ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(باقی آئندہ)

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے پیش کردہ اصولِ تاریخ صرف گزشتہ اقوام کے لیے ہی نہیں بلکہ موجودہ قوموں کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔

صفحات: ۲۱۶ — قیمت: چار روپے پچیس پیسے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور